© rasailojaraid.com

(۲) وَلَوْ أَنَّمَا فِیْ الْأَرْضِ مِن شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ وَالْبَحْرُ یَمُدُّهُ مِن بَعْدِهِ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ کَلِمَاتُ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ۔ (لقمان:۲۷)

''روئے زمین کے (تمام) درختوں کے اگر قلمیں ہو جائیں اور تمام سمندروں کی سیاہی ہو اور ان کے بعد سات سمندر اور ہوں تاہم اللہ کے کلمات ختم نہیں ہو سکتے، بیشک اللہ تعالیٰ غالب اور باحکمت ہے'' (محمد جونا گڑھی، یہاں تمام سمندروں کے بجائے سمندر ہونا چاہیے)

''اور اگر زمین میں جتنے پیڑ ہیں سب قلمیں ہو جائیں اور سمندر اس کی سیاہی ہو اس کے پیچھے سات سمندر اور تو اللہ کی باتیں ختم نہ ہوں گی بیشک اللہ عزت وحکمت والا ہے'' (احمد رضا خان)

''اور اگر یوں ہو کہ زمین میں جتنے درخت ہیں (سب کے سب) قلم ہوں اور سمندر (کا تمام پانی) سیاہی ہو (اور) اس کے بعد سات سمندر اور (سیاہی ہو جائیں) تو خدا کی باتیں (یعنی اس کی صفتیں) ختم نہ ہوں۔ بیشک خدا غالب حکمت والا ہے'' (فتح محمد جالندھری)

''اور اگر زمین میں جو درخت ہیں وہ قلم بن جائیں اور سمندر سات سمندروں کے ساتھ (روشنائی بن جائیں) جب بھی اللہ کی نشانیاں قلم بند نہیں ہو سکتیں۔ بے شک اللہ غالب اور حکمت والا ہے'' (امین احسن اصلاحی)

(۲) قُل لَّوْ کَانَ الْبَحْرُ مِدَاداً لِّکَلِمَاتِ رَبِّیْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَن تَنفَدَ کَلِمَاتُ رَبِّیْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَداً۔ (الکھف:۱۰۹)

''کہہ دو کہ اگر سمندر میرے پروردگار کی باتوں کے (لکھنے کے) لئے سیاہی ہو تو قبل اس کے کہ میرے پروردگار کی باتیں تمام ہوں سمندر ختم ہو جائے اگرچہ ہم ویسا ہی اور (سمندر) اس کی مدد کو لائیں'' (فتح محمد جالندھری)

''کہہ دیجئے کہ اگر میرے پروردگار کی باتوں کے لکھنے کے لئے سمندر سیاہی بن جائے تو وہ بھی میرے رب کی باتوں کے ختم ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جائے گا، گو ہم اسی جیسا اور بھی اس کی مدد میں لے آئیں'' (محمد جونا گڑھی)

''اے محمدؐ، کہو کہ اگر سمندر میرے رب کی باتیں لکھنے کے لیے روشنائی بن جائے تو وہ ختم ہو جائے مگر میرے رب کی باتیں ختم نہ ہوں، بلکہ اتنی ہی روشنائی ہم اور لے آئیں تو وہ بھی کفایت نہ کرے'' (سید مودودی)

''کہہ دو اگر میرے رب کی نشانیوں کو قلم بند کرنے کے لیے سمندر روشنائی بن جائے تو میرے رب کی نشانیوں کے ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہو جائے گا اگرچہ ہم اس کے ساتھ اسی کے مانند اور سمندر ملا دیں'' (امین احسن اصلاحی)

دوسری آیت میں (لو کان) آیا ہے، اس کے لحاظ سے ترجمہ ماضی کا ہونا چاہئے، نہ کہ مستقبل کا جیسا کہ عام طور سے مترجمین نے کیا ہے، درست ترجمہ یوں ہوگا: کہہ دو اگر میرے رب کی نشانیوں کو قلم بند کرنے کے لیے سمندر روشنائی بن جاتا تو میرے رب کی نشانیوں کے ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہو جاتا اگرچہ ہم اس کے ساتھ اسی کے مانند اور سمندر ملا دیتے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آرا وافکار

ڈاکٹر محمد اکرم وِرک*

درک ''دراِدراک''

مسیحیت، ہندومت، بدھ مت، اور دیگر مذاہب کی ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ انھوں نے ترک دنیا اور رہبانیت کے تیشے سے انسانی جسم کو صرف اس لیے گھائل کر دیا تا کہ انسانی روح کو بیدار کیا جا سکے، لیکن اس غیر طبعی تعلیم اور جان سوزی کے نتیجے میں روح کی شمع بھی گل ہو کر رہ گئی۔ اہل کلیسا نے خانقاہوں میں بسیرا کر لیا، ہندوؤں اور بدھوں نے جنگلوں کا رخ کر لیا۔ مسیحیت کی غیر فطری تعلیمات کے ردِ عمل میں پروان چڑھنے والے مغربی فکر و فلسفہ میں یورپ کے ارباب فکر و دانش نے مادہ پرستی کی رو میں بہتے ہوئے نہ صرف روح کے ہر تقاضے کو نظر انداز کر دیا بلکہ روح ہی کا انکار کر دیا اور اس عالم رنگ و بو کو ہی انسانیت کا منتہا قرار دیا۔ جسم کی تو خوب پرورش کی، لیکن روح کو کچل کر رکھ دیا۔ نتیجہ کے طور پر وہ انسان تیار ہوا جو ان اخلاقی اقدار ہی سے عاری ہے جو اس کا طرۂ امتیاز ہے۔ مغرب کی اخلاقی اقدار کسی روحانی محرک سے محروم ہیں۔ اخلاقی قدروں کی ترویج میں بھی مارکیٹنگ کی نفسیات کارفرما ہے۔ "Eathical guide book for call girl" جیسی کتابوں کا سرعام فروخت کے لیے پیش کیا جانا مغرب کے اخلاقی بحران اور دیوالیہ پن کا نکتہ کمال ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مذاہبِ عالم کے زوال کے بعد مغربی تہذیب بھی اپنے زوال کی منازل طے کر رہی ہے، اور اس زوال کی سب سے بڑی وجہ ''فطرت'' کے نام پر فطرت سے بغاوت ہے۔ بقول اقبال

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

مغربی تہذیب کا سب سے تباہ کن پہلو یہ ہے کہ اس نے روح اور بدن میں افتراق پیدا کر دیا ہے، حالانکہ انسان کی شخصیت روح اور بدن کی تالیف اور امتزاج سے عبارت ہے۔ ایسا کوئی مذہب اور کوئی نظریہ کامیاب نہیں ہو سکتا جو روح اور بدن میں سے ایک کو ابھارے اور دوسرے کو کچل دے۔ مغربی تہذیب نے گذشتہ کئی صدیوں میں فکری ارتقاء کا کٹھن سفر طے کیا ہے، مسلسل فکری ارتقاء اور تجربات کے نتیجے میں اس کے ہاں کئی تصورات اور نظریات اب مسلمہ عقائد کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ اہل مغرب اب ان نظریات پر کوئی سمجھوتا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ مغرب نے سماجی، معاشرتی اور اخلاقی حوالے سے جو تجربات کیے ہیں، اس کے نتیجے میں ان کے ہاں یہ سوچ پختہ ہو رہی ہے کہ

* چیئرمین شعبہ علوم اسلامیہ، گورنمنٹ IP/G اسلامیہ کالج، گوجرانوالہ۔ drmakramvirk@yahoo.com

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انسانیت اپنے سماجی ارتقاء کی آخری سیڑھی پر قدم رکھ چکی ہے۔ مغرب میں "The End of History" کے عنوان سے لکھی جانے والی کتب اسی سوچ کی مظہر ہیں۔ اس اندازِ فکر پر یہ سوال بہرحال موجود ہے کہ پھر انسان مسلسل روحانی اور اخلاقی بحران کا شکار کیوں ہے؟ کمی کہاں پر ہے؟

اسلام کا امتیاز یہ ہے کہ اس نے آزادیٔ اظہارِ رائے، انسانی جان کی حرمت، انسانی مساوات، سماجی انصاف، حقوقِ نسواں، مذہبی آزادی، عدلِ اجتماعی اور امن عالم جیسے تصورات کو مذہبی اور روحانی بنیادیں فراہم کیں۔ مذاہب عالم اور جدید مغربی فکر وفلسفہ کے مقابل اسلام کا امتیاز یہ ہے کہ اس نے روح اور جسم دونوں کی ضروریات کو پیش نظر رکھا ہے۔ مذاہبِ عالم میں شاید اسلام ہی واحد دین ہے جس نے خالصتاً روحانی غلطیوں پر بھی مالی جرمانے کی سزا عائد کی ہے۔ حکم ہے کہ اگر رمضان کا روزہ ٹوٹ جائے تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلایا جائے۔ قسم ٹوٹنے کی صورت میں تین مسکینوں کو کھانا کھلانے کا حکم ہے۔ اپنی بیوی سے ظِہار کی صورت میں ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانے کا حکم ہے۔ حتیٰ کہ قتل جیسے سنگین معاملے میں مقتول کے ورثاء ضرورت مند ہوں تو وہ دیت پر صلح کر سکتے ہیں۔ گویا اسلام کی نظر میں ضرورت مندوں کی دادرسی سے ہی روحانی سکون حاصل ہوسکتا ہے۔ اسلام کے نظامِ عبادت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کا بنیادی فلسفہ عدلِ اجتماعی کا قیام ہی ہے۔

دینِ اسلام پر اس انداز سے غور کرنے سے اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں انسان کی معاشی، سماجی اور معاشرتی زندگی اور حقوق کی اہمیت کو سمجھا جاسکتا ہے۔

اعلانِ نبوت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سماجی زندگی لوگوں کے لیے آپ ؐ کی نبوت ورسالت کی دلیل ٹھہری۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی قرآن وسنت اور اسوۂ رسول ؐ سے یہی اُخذ کیا کہ وہی شخص اللہ تعالیٰ کی نظر میں معتبر ہے جو اس کے بندوں سے اپنے معاملات ٹھیک رکھتا ہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ حضرت عمرؓ (م ۲۳ھ) نے ایک شخص کے حال کی تحقیق کے لیے گواہ طلب کیے تو ایک آدمی نے گواہی دی کہ موصوف ایک شریف آدمی ہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اس سے بڑا اہم سوال کیا کہ کیا آپ اس کے پڑوسی ہیں؟ اس نے عرض کی کہ نہیں۔ پھر پوچھا کہ کیا آپ نے اس کے ساتھ کبھی لین دین کیا ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ پھر فرمایا کہ کبھی اس کے ساتھ سفر کیا ہے؟ اس نے عرض کیا کہ نہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: تم نے اسے رکوع وسجود اور ذکر اذکار میں مشغول دیکھا ہوگا؟ اس کہا جی ہاں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا: تم اسے نہیں جانتے اور پھر حضرت عمرؓ نے اس شخص کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کسی ایسے شخص کو بلاؤ جو تمہیں جانتا ہو۔ گویا حضرت عمرؓ کی نظر میں کسی انسان کی اصل پہچان عبادت وریاضت سے نہیں بلکہ اس کے سماجی رویے سے ہوتی ہے۔

امام محمد بن حسن الشیبانی (م ۱۸۵ھ) فقہ حنفی کے مدونِ اول تھے ان سے کسی نے سوال کیا کہ آپؒ نے زہد اور رِقاق کے موضوع پر کوئی کتاب نہیں لکھی کہ لوگ اس کو پڑھتے اور ان کے دلوں میں تقویٰ پیدا ہوتا۔ آپؒ نے فرمایا کہ میں نے کتاب البیوع لکھ دی ہے۔ یعنی جو شخص کتاب البیوع میں حلال وحرام کے احکام پر مسلسل عمل کرے گا اس میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تدین ضرور پیدا ہوگا۔ دنیا دار العمل ہے اور عمل کا ''معیاری اظہار'' حلال و حرام کی تمیز اور مثبت سرگرمیوں سے ہوتا ہے۔

اسلام کی نظر میں سماجی زندگی کی اس اہمیت کے پس منظر میں ہمارے قابل قدر تلمیذ محمد تہامی بشر علوی کی تحریروں کا زیر نظر مجموعہ ''درِادراک'' ایک قابلِ قدر کاوش ہے۔ یہ تصنیف کل تین حصوں پر مشتمل ہے، جبکہ زیر تبصرہ حصہ کتاب کے آخری دو حصے ہیں۔ فاضل محقق نے اپنی ان تحریروں میں سماجی رویوں کی تشکیل میں اسلام کے کردار کی اہمیت کو خوب اجاگر کیا ہے۔ موصوف نے داعیانہ اسلوب اور پورے دردِ دل کے ساتھ مختلف طبقات میں موجود خرابیوں کی نشاندہی کی ہے اور ان خرابیوں کے اسباب و وجوہ کا تجزیہ کرنے کے بعد حل بھی تجویز کیا ہے۔

ہمیں نہایت تاسف سے اعتراف کرنا چاہیے کہ آج علماء کرام عمل کے معیاری اظہار کے فروغ کے بجائے تبلیغ محض کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ دین کی بجائے مسلک کی تبلیغ روز افزوں ہے، نادان لوگوں نے اپنے اپنے مسلک کو ہی کل دین سمجھ لیا ہے۔ دینداری کے بجائے فنِ دین داری کا خوب دور دورہ ہے۔ ظاہری وضع قطع اور عبادت کے نام پر چند عادات اور مرنے جینے کی مخصوص رسموں کے علاوہ دین کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ اور جس مسلک کی دین کے نام سے تبلیغ کی جا رہی ہے اس کا غالب حصہ بھی مابعد الطبعیاتی مباحث سے متعلق ہے۔ نور و بشر، علم غیب، حاضر و ناظر، محرم، میلاد اور گیارہویں کی مجالس کے جواز اور عدم جواز کی بحثیں ہی زندہ موضوعات ہیں۔ عام لوگوں میں یہ سوچ پختہ ہو رہی ہے کہ مذہب کا ریاست، سیاست اور معاشرت وغیرہ سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ لوگ بجا طور پر یہ سمجھنے لگے ہیں کہ دین کا چونکہ دنیوی امور سے کوئی تعلق نہیں ہے، لہٰذا اس کے حقیقی فوائد و ثمرات کے لئے فوت ہونا ضروری ہے۔ معاشرتی اصلاح اور سماجی رویوں کی تشکیل میں اسلام کے کردار کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ علماء کرام لوگوں کے سماجی اور نفسیاتی مسائل اور عرف سے بڑی حد تک نابلد ہیں۔ مذہبی طبقے میں دعوت و تبلیغ کی جگہ فتویٰ بازی سکہ رائج الوقت ہے، فتویٰ بازی میں عرف اور سماجی رویوں کا مطالعہ کرنے کی بجائے محض فتاویٰ جات کی قدیم کتب سے استفادہ کافی سمجھا جاتا ہے۔ معاشرتی اصلاح اب مذہبی طبقے کی ترجیحات میں آخری درجے میں ہے۔ فاضل محقق نے دینی مدارس کے موجودہ کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے خوب لکھا ہے:

> ''ایک وقت تھا جب مدرسے تعلیمی ادارے ہوا کرتے تھے۔ پھر المیہ یہ ہوا کہ اب یہ مسلک پرستوں کے تحریکی ادارے بن کر رہ گئے ہیں۔ یہاں ''میں اور میرا مسلک'' عین حق اور میں اور میرے مسلک کے سوا مکمل باطل کا نفسیاتی شاکلہ تیار ہوتا ہے۔''

اقبال سے انتہائی معذرت کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے:

گلا تو گھونٹ دیا ''اہل مدرسہ'' نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الہ الا اللہ

عام طور پر دعویٰ کیا جاتا ہے کہ "THE SOCIAL CONTRACT" کا مصنف مشہور فرانسیسی مفکر اور دانشور ژاں ژاک روسو (م ۱۷۷۸ء) انسانی تاریخ کا پہلا شخص ہے جس نے انسانی ضروریات اور احتیاجات کو اس کا ''حق''

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ثابت کیا ہے۔ ہماری بدنصیبی ملاحظہ کیجئے کہ مغرب کی طرف سے آنے والی کوئی انسانی قدر جب شہرتِ دوام حاصل کرنے لگتی ہے تو ہم اسے قرآن وحدیث سے ثابت کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ اگرچہ حکمت مومن کی گمشدہ میراث ہے وہ اس کو جہاں بھی پائے حاصل کرلے،لیکن اگر وہ جواہر پارہ براہِ راست ہمارے علمی خزانے کا حصہ ہواور ہم اپنی کورچشمی کی وجہ سے اس کو دیکھ ہی نہ پارہے ہوں تو اس پر ماتم کے سوا کیا کیا جا سکتا ہے۔ اب بھلا کون ہماری اس بات پر غور کرے گا کہ انسانی تاریخ میں روسو نہیں بلکہ اسلام نے سب سے پہلے انسانی ضروریات کو انسان کا ''حق'' ثابت کیا ہے۔سورۃ الذاریات میں ہے:

وَفِیْ أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ (۱۹/۵۱)

ترجمہ: اوران مالوں میں سائل اورمحروم لوگوں کا ''حق'' ہے۔

یہ آیت مکی دور میں نازل ہوئی اور اس وقت تک زکوٰۃ فرض نہیں ہوئی تھی۔ مطلب یہ کہ زکوٰۃ کی فرضیت سے پہلے ہی مسلمانوں کی تربیت اس ماحول میں ہورہی ہے کہ اسلامی ریاست کے قیام کے بغیر بھی ان پر دوسرے مسلمانوں کی ضروریات کو پورا کرنا بطور ''حق'' لازم ہے۔قرآن وسنت میں زکوٰۃ اور صدقہ جیسے الفاظ ''فریضہ'' اور ''حق'' کے معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔ کسی چیز کو خیرات کے طور پر مانگنے اور حق کے طور پر طلب کرنے میں زمین وآسمان کا فرق ہے ،لیکن ہماری غلط دینی تعبیرات کا نتیجہ یہ ہے کہ عام لوگوں کا تو کیا کہنا پڑھے لکھے لوگ بھی زکوٰۃ اور صدقہ کو خیرات کے ہم معنی ہی سمجھتے ہیں۔فقیہ شہر کا فتویٰ یہ ہے کہ فرض تو قرض کی طرح ہے جنت کا ٹکٹ تو صرف اس کے لیے کنفرم ہوگا جو 'خیرات' بانٹتا ہے۔اس تبلیغ کا نتیجہ یہ ہے کہ آج باوسائل اور مقتدر طبقہ مزدور اور غریب کے لازمی حق کو نظرانداز کرکے صدقہ وخیرات کے نام پر اس کا استیصال رہا ہے۔مقتدر طبقات کی نظر میں مزدور اور غریب کو اس کا حق دینے کی بجائے خیرات دینا پسندیدہ عمل ہے تاکہ اس کی گردن ہمیشہ اپنے مالک کے سامنے جھکی رہے اور وہ انہیں اپنا آقا ومولیٰ سمجھتا رہے۔ زیرِنظر کتاب میں اس معاشرتی کجی کی ان الفاظ میں نشاندہی کی گئی ہے:

> ''پاکستان دنیا کا کم ترین مزدوری دینے والا ملک ہے،اور پاکستان ہی دنیا کا سب سے زیادہ خیرات کرنے والا ملک بھی ہے۔ ہمارے معاشرے کا یہ تضاد ایک بہت بڑی کجی کا اظہار ہے۔ہم نے مزدور کے استحصال کو ایک معاشرتی قدر بنا دیا ہے۔ہم پہلے ان کو کم مزدوری دے کر محتاج بناتے ہیں، پھر ان کی محتاجیوں سے مزید محتاجیاں جنم لیتی ہیں،اور پھر ہم صدقہ وخیرات سے ان محتاجوں کی مدد کر کے ان کو اپنا احسان مند بھی بنا لیتے ہیں اور اس احسان مندی سے ایک طرف ہم اپنا کاروبار چمکاتے ہیں اور دوسری طرف ان کی دعاؤں سے جنت کے محل تعمیر کرا لیتے ہیں۔''

ایک غیر ہنرمند مزدور کے خاندان کو ماہانہ تقریباً 36,000 سے 40,000 ہزار درکار ہیں جبکہ حکومت نے کمال مہربانی سے مزدور کی کم ازکم اجرت 13 سے 14 ہزار روپے مقرر کی ہے۔جبکہ مزدوروں کا ایک طبقہ اس سے بھی کم ماہانہ تنخواہ پارہا ہے۔ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ مذہب سے گہری عقیدت رکھنے والا سرمایہ دار بھی مزدور کو اس کا حق دینے کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بجائے خیرات دینا ہی پسند کرتا ہے۔کسی کی عزت نفس کا لحاظ، اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں کتنے رتبے کا کام ہے، کاش یہ بات ہم پر کھل جائے تو یقین کیجئے معاشرے کا مزاج ہی تبدیل ہو جائے۔لوگ خیرات بھی رات کے اندھیرے میں دینا پسند کریں گے۔

دنیا کے تمام مذاہب نے مختلف طبقات کے حقوق کی نشاندہی اپنے اپنے اسلوب میں کی ہے، بالخصوص جدید مغربی معاشرے میں بنیادی انسانی حقوق کی تحریک کا منظّم ظہور ہوا ہے۔مغرب بجا طور پر انسانی حقوق کی جدید تحریکوں کا بانی ہے، لیکن محض حقوق کے مطالبات سے معاشرے میں ٹکراو کی نفسیات جنم لیتی ہیں سماجی سطح پر اس حوالے سے اسلام کا اسلوب بہترین ہے کہ حقوق کے شعور کے ساتھ اصل زور فرائض کی ادائیگی پر دیا جائے۔جب ہر طبقہ اپنے فرائض کو ادا کرنے لگے تو کسی طبقے کے حقوق پامال نہیں ہوں گے۔بظاہر یہ بات معمولی نظر آتی ہے لیکن نتائج کے اعتبار سے یہ طرزِ عمل دوررس نتائج کا حامل ہے۔مغرب میں اس طرزِ فکر کی ایک بڑی مثال حقوقِ نسواں کی جدید تحریک ہے جس نے عورت کو بھڑکا کر مرد کا مدمقابل بنا دیا ہے۔جس کے نتیجے میں مغرب میں خاندانی نظام کا شیرازہ بکھر رہا ہے۔عورتوں کا اپنے حقوق سے آگاہ ہونا بے شک ضروری سہی لیکن اس سے بھی زیادہ ضروری یہ ہے کہ عورت کے حوالے سے مرد پر بحیثیت باپ، بھائی اور شوہر جو فرائض عائد ہوتے ہیں ان کا شعور اتنے تسلسل سے اجاگر کیا جائے کہ حقوق نسواں کی کسی تحریک کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔اس حوالے سے ہمارے فاضل تلمیذ نے آج کے معروضی حالات کے تناظر میں معاشرتی اصلاح کے لیے زیرِ نظر کتاب میں عورت کے حقوق اور مرد کے فرائض کے حوالے سے اہم نکات کی طرف توجہ دلائی ہے۔تفصیل کے لیے: ''نکاح کے بعد''، ''بیوی پر پابندیاں''، ''شادی کا فیصلہ''، ''رفیق حیات کا فیصلہ کیسے ہو؟''، کے عنوانات ملاحظہ فرمائیں۔

کسی معاشرے کی طاقت اس کا اتحاد اور یکجہتی ہے، اسلام کی برکت سے جب عربوں میں اتحاد و یگانگت کا ظہور ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس اتحاد کا اپنے خصوصی فضل کے طور پر تذکرہ فرمایا اسی اتحاد کی بدولت وہ موقع پیدا ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حقیقی معنوں میں 'خاک کے ذروں کو ہمدوش ثریا کر دیا' لیکن پھر 'اپنی ملت کو اقوام مغرب پر قیاس نہ کرنے والوں' نے اس سبق کو بھلا دیا تو اللہ نے بھی ان کو بھلا دیا۔خاک مدینہ و نجف کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بنانے والی قوم فرقہ بندی کے عفریت کی نظر ہوگئی۔اب صورتِ حال یہ ہے کہ فرقہ وارایت کا جن بے قابو ہو چکا ہے۔مسئلہ صرف مذہبی تعصّبات تک محدود نہیں رہا بلکہ ہمارے سماج میں فرقہ وارایت کا ظہور کئی شکلوں میں ہو رہا ہے۔اس وقت مسلم معاشرے کا اتحاد ذات برادری، مسلکی، فقہی، لسانی، جغرافیائی اور نسلی تعصّبات کے طوفان میں بری طرح گھر چکا ہے۔جس طبقے کے ذمے ان تعصّبات کے خلاف سر پر کفن باندھ کر میدان کارزار میں نکلنا تھا اس کی نظر میں سرے سے یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ ہمارے مذہبی طبقے میں تو یہ موضوع سماجی مسئلے کے طور کم ہی زیر بحث آتا ہے۔اس تناظر میں فاضل مصنف نے اتحاد و یکجہتی کو پارہ پارہ کرنے والے منفی سماجی رویوں کو پوری قوت سے اجاگر کیا ہے۔موصوف نے ''قبیلہ پرستی''، ''تعصّبات اور قبیلہ پرستی خدا اور رسولؐ کی نظر میں''، ''قبیلے سے باہر شادیاں''، ''بزرگوں کے طور طریقے''، ''اب

© rasailojaraid.com